فروری ۴۵ء کا "نگار"

جنوری کے پرچہ میں شامل تھا۔ علٰحدہ شایع نہیں ہوا

نگار

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

ادارۂ معاون: اخوند فیض محمد فاروقی
مجدد نیازی — شوکت جہاں

جلد ۴۷	فہرست مضامین مارچ ۴۵ء	شمار ۳

ملاحظات ---------- ۲

ترقی پسند شاعری ---------- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ---------- ۹

ماخذ القرآن پر ایک نظر ---------- شوکت سبزواری ام۔اے ---------- ۲۶

زمانۂ حال کی ہندی شاعری ---------- ۳۶

مسٹر ٹلیوکس ---------- اخوند فیض محمد فاروقی ---------- ۴۱

معلومات عامہ ---------- ۴۳

مالہ وماعلیہ ---------- ۴۴

باب المراسلۃ والمناظرہ ---------- ۴۶

غزل فارسی، خان بہادر رضا علی وحشت ---- عشق ناتمام (نظم)، جمیل مظہری ---------- ۵۱

غزل ---------- راز رامپوری ---------- ۵۲

فرشتوں کی چہ میگوئیاں (نظم) ---------- پروفیسر شور علیگ ---------- ۵۳

حدیث فراق (نظم) ---------- سیدہ اختر ---------- ۵۴

مطبوعات موصول ---------- ۵۵

"انتقادیات" کے مضامین کی فہرست صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ کیجئے

ملاحظات

ماخذ القرآن

میں نے جنوری فروری کی مشترکہ اشاعت میں ظاہر کیا تھا کہ ڈاکٹر ٹسڈل کے ایرادات کا جواب علماء کرام کی طرف سے مارچ میں شایع ہوگا، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اکثر نہیں تو کم از کم ایک دو حضرات کا جواب ضرور ملجائے گا اور اس طرح مارچ سے یہ سلسلہ شروع ہوسکے گا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک اُن اصحاب میں سے کسی ایک کا جواب موصول نہیں ہوا، جن کو میں نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا تھا

میں نے ستمبر ۴۴ء میں متعدد علماء کرام[1] کے نام ایک مطبوعہ تحریر روانہ کی کہ میں عیسائی مشنری کے بعض وہ اعتراضات آیندہ جنوری میں شایع کرنا چاہتا ہوں جو قرآن اور اسلام پر کئے گئے ہیں بشرطیکہ آپ لوگ جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں میری اس تحریر کے جو جوابات موصول ہوئے[2]، ان میں سے اکثر میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اعتراضات کے ساتھ جوابات بھی شایع کئے جائیں، لیکن بعض نے یہ قید نہیں لگائی

میں نے اکتوبر کے ملاحظات میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ظاہر کیا کہ اعتراضات و جوابات دونوں کو ایک ساتھ شایع کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح رسالہ کا حجم کئی سو صفحات کا ہو جائے گا اور اتنا کاغذ فراہم ہونا فی الحال ممکن نہیں۔ اس کے بعد نومبر کے نگار میں، میں نے صراحتاً بتایا کہ میں ڈاکٹر ٹسڈل کے ان اعتراضات کو شایع کرنا چاہتا ہوں۔ جو

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی ـــــ محمد اویس نگرامی ـــــ مولانا عبدالماجد دریابادی ـــــ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ـــــ مولانا امین احسن اصلاحی ـــــ مولانا سید مناظر احسن گیلانی ـــــ مولانا بشیر احمد عثمانی ـــــ مولانا ثناء اللہ صاحب ـــــ مولانا محمد علی صاحب ام-اے ـــــ مولانا منظور محمد صاحب نعمانی ـــــ مولانا کفایت اللہ صاحب ـــــ مولانا عبدالسلام خانصاحب۔ مولانا وجیہ الدین خاں صاحب ـــــ مولانا حافظ کفایت حسین صاحب ـــــ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ـــــ مولانا علی نقی النقوی ـــــ مولانا مسعود عالم صاحب ـــــ ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی ـــــ مولانا سعید احمد صاحب ـــــ مولانا حفیظ الرحمان صاحب ـــــ مولانا قاری محمد طیب صاحب ـــــ مولانا آزاد سبحانی ـــــ مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب ـــــ مولانا عبدالقدیر بدایونی ـــــ مولانا اسلم جیراجپوری ۔

[2] ان میں بعض نہایت دلچسپ ہیں اور ان کی نقل کسی آیندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی ۔

"ماخذالقرآن" کے عنوان سے اس نے اپنی ایک مستقل تصنیف میں پیش کئے ہیں، اس پر بعض حضرات نے لکھا کہ ان اعتراضات کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے لیکن جب میں نے انھیں حاصل کر کے پڑھا، تو معلوم ہوا کہ یہ جوابات اول تو زیادہ تر "ینابیع الاسلام" سے تعلق رکھتے ہیں جو ڈاکٹر ٹسڈل نے بہت پہلے فارسی میں لکھی تھی نہ کہ "ماخذالقرآن" سے دوسرے یہ کہ جوابات بھی بالکل تشنہ و نامکمل ہیں اور اب سے ایک رُبع صدی پہلے کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں چنانچہ میں نے دسمبر کے نگار میں اس کا اعلان کر دیا کہ جنوری میں "ماخذالقرآن" کی اشاعت طے پا گئی ہے اور ۱۵ جنوری کو میں نے ان تمام علماء کرام کے پاس ایک ایک کاپی بھیجدی، جن کا نام پہلے ظاہر کیا جا چکا ہے۔

اس کی رسید سب سے پہلے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے دی اور بعض دیگر علماء کے نام بھی تجویز کئے چنانچہ میں نے ان حضرات کو بھی یہ پرچہ بھیجدیا اور علاوہ ان کے بعض اور علماء کو بھی جن کے نام بعض اور حلقوں کی طرف سے پیش کئے گئے تھے

اس وقت تک جواب نہ آنے سے میں مایوس نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ دو چار حضرات کی طرف سے ضرور ایسے جوابات موصول ہوں گے، جن میں ڈاکٹر ٹسڈل کے ان ایرادات پر کافی سنجیدگی و متانت کے ساتھ علمی و تاریخی روشنی ڈالی جائیگی

رسالۂ البیان اور نگار

مجھے نہیں معلوم کہ جنوری فروری کی اشاعت نگار کا ذکر ملک کے دیگر اخبارات و رسایل نے کس طرح کیا، لیکن امت مسلمۂ ہند امرتسر کے مشہور رسالہ البیان نے جس روشنی یا تاریکی میں اس کو دیکھا، اس کا علم البتہ مجھے اس کی تازہ اشاعت سے ہوا

اس کے مدیر وہی عرشی صاحب ہیں جو اس سے قبل "براہین وحی" کے نام سے ایک مستقل تالیف بحث وحی والہام میں میرے خلاف شائع[1] کر چکے ہیں

انھوں نے البیان کی اس اشاعت میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا بلکہ علماء کرام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو ہرگز قابل التفات نہ سمجھیں، کیونکہ اول تو ان اعتراضات کا جواب "ہمارے علماء محققین اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں" اور دوسرے یہ کہ "اس شخص (یعنی اڈیٹر نگار) کا مقصود اپنی گرم بازاری اور نوجوانوں کی گمراہی کے سوا کچھ نہیں ——"

عرشی صاحب کے علاوہ اور بھی دیگر حضرات نے مجھے لکھا ہے کہ ان اعتراضات کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے لیکن جب میں یہ پوچھتا ہوں کہ جواب کب، کس نے اور کیا دیا ہے، تو سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ جوابات واقعی دئے جا چکے ہیں اور وہ اپنی جگہ مکمل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو پھر نہ شایع کیا جائے، کیا

---

[1] اس تالیف میں ملک کے بڑے بڑے علماء و اہل قلم نے حصہ لیا ہے اور جس پر کسی آیندہ اشاعت میں مفصل تبصرہ شایع ہوگا۔

حق کا بار بار اظہار کوئی بُری بات ہے اور کیا عرشی صاحب کو قرآن و حدیث میں کوئی ایسی ہدایت نظر آئی ہے جس میں ایک بار سے زیادہ سعیِ اصلاح و اظہارِ حق کو ناجائز و غیر مستحسن قرار دیا گیا ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ عرشی صاحب اس "فتنۂ خفتہ" کی بیداری سے کہیں اسلئے تو خایف نہیں کہ وہ ان جوابات کی کمزوری سے آگاہ ہیں اور وہ دوبارہ ان کے پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے

مولانا عرشی اپنی عالمانہ واقفیت و آگاہی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ :۔ "آج سے کوئی ۴۰، ۵۰ برس پہلے پادری ٹسڈل نے ینابیع الاسلام نامی ایک کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ اُردو، فارسی، انگریزی زبانوں میں ہو چکا تھا۔ اور اس موضوع پر ہمارے علما محققین اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں — اب نیاز فتحپوری نے اسی کتاب کا کیا کرایا ترجمہ اپنی طرف سے "ماخذ القرآن" نام بدلکر من و عن شایع کر دیا ہے"

مولانا عرشی کا فرش زمین کے حالات سے اس قدر بے خبر رہنا حیرتناک بات ہے۔ یہ مجاہد اسلام اتنا بھی نہیں جانتا کہ سب سے پہلے ٹسڈل نے "ینابیع الاسلام" فارسی زبان میں لکھی تھی اور اس کے برسوں بعد اس نے دوسری تصنیف انگریزی میں شایع کی اور اسی کتاب کا ترجمہ نگار میں شایع ہوا ہے، جو کہیں "کیا کرایا" نہیں تھا۔ جناب عرشی نے مجھ پر ایک الزام یہ بھی قایم کیا ہے کہ "کتاب کے متعلق کوئی ایک سطر کا تعارفی نوٹ بھی نہیں لکھا کہ یہ کتاب کب شایع ہوئی، کہاں شایع ہوئی، کس زبان میں شایع ہوئی، مصنف کی کیا پوزیشن ہے وغیرہ وغیرہ"

افسوس ہے کہ عرشی صاحب نے نومبر اور دسمبر کا نگار نہیں دیکھا ورنہ وہ یہ الزام مجھ پر قایم نہ کرتے، میں نے ان دونوں اشاعتوں میں تفصیل کے ساتھ تمام وہ باتیں ظاہر کر دی تھیں جن کا مطالبہ عرشی صاحب کی طرف سے کیا گیا ہے[1]۔ یہ میں نے اس لئے ظاہر کر دیا کہ عرشی صاحب کو حالات کا صحیح علم ہو جائے اور اگر انھوں نے محض عدم واقفیت کی وجہ سے "دامن کشاں" گزر جانے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ اسے واپس لیں اور مہربانی فرما کر از سر نو جواب دینے کی زحمت

---

[1] نومبر کے نگار میں میں نے لکھا تھا کہ :

"جو اعتراضات میں پیش کرنے والا ہوں، وہ ایک مشہور مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل کے ہیں جن میں انھوں نے قرآن مجید کو غیر الہامی ثابت کرنے کے لئے اس کے ماخذ سے بحث کی ہے — ڈاکٹر ٹسڈل نے سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں (جبکہ وہ ایران میں مشنری کی خدمت انجام دے رہے تھے) فارسی میں ایک مختصر سا رسالہ اس موضوع پر "ینابیع الاسلام" کے عنوان سے شایع کیا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ پہلی کوشش تھی جسے وہ ناتمام ظاہر کرتے ہیں، اور اس کے بعد انھوں نے زیادہ بسیط کتاب انگریزی میں شایع کی جس کا نام The original Sources of the Quran ہے

"ینابیع الاسلام" کا جواب تو احمدی جماعت کی طرف سے انگریزی میں عرصہ ہوا شایع ہو چکا ہے (اگرچہ وہ جواب کہلانے کے قابل نہیں) لیکن ٹسڈل کی اس دوسری کتاب کی طرف ابتک کسی نے توجہ نہیں کی"

گوارا فرمائیں اور نگار ہی میں شایع کرائیں، خواہ اس میں مجھ کو بُرا کہنے کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا گیا ہو۔

صرف یہ کہہ دینے سے کہ ان اعتراضات کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے، کام نہیں چل سکتا کیونکہ اول تو واقعی کوئی جواب ان اعتراضات کا دیا ہی نہیں گیا اور اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس کے اعادہ و تکرار میں کیا حرج ہے۔ اب سے ۳۰، ۴۰ سال پہلے کی لکھی ہوئی چیز موجودہ ذہنیتوں کے لحاظ سے اِسوقت بیکار ہے اور آج جو کچھ لکھا جائے گا وہ آیندہ ۵۰ سال کے بعد بیکار ہو جائے گا، اس لئے محض پچھلے ریکارڈ کا حوالہ دیکر خاموش ہو جانا در اصل اک نوع کا احساس کمتری ہے، جس سے اندیشہ ہے کہ مبادا میری "گرم بازاری اور نوجوانوں کی گمراہی" زیادہ بڑھ جائے اور یہ دونوں باتیں ایسی نہیں جنھیں عرشی صاحب اور ان جیسے دوسرے پُرجوش حامیان اسلام و مدعیان نگار گوارا کر سکیں۔

زمانہ کا اقتضاء یہ زمانہ وہ نہیں کہ بات بات پر محض "معاذاللہ - لاحول ولاقوۃ - استغفراللہ" کہہ دینے سے لوگوں کو مطمئن کیا جا سکے، یا مجھے جاہل و نامعقول، کافر و ملحد، ذلیل و کمینہ[1] کہہ دینا ہی میرے خدشات کا کافی جواب سمجھا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی تحریروں سے وہ اس جماعت میں اپنے تقدس کا رسوخ قایم رکھ سکیں، جس کے ہوش و حواس سلب کر کے انھوں نے پہلے ہی اس قابل نہیں رکھا کہ وہ کسی اور کی بات سن سکیں، لیکن وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ معقول باتیں محراب و منبر کے علاوہ دوسری جگہ بھی سنی جا سکتی ہیں، وہ اس سب و شتم سے مطمئن نہیں ہو سکتے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مذہب کے خلاف کوئی بات سُنکر ہمارے علماء کی تیوریاں کیوں چڑھ جاتی ہیں، وہ غصّہ سے کیوں بیتاب ہو جاتے ہیں، اُن کی زبان پر سب سے پہلے گالی کیوں آتی ہے۔ وہ متانت و سنجیدگی کیوں ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں اور وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کا یہ انداز گفتگو خود ان کے احساس کمتری کا ثبوت ہے اور مہذب طبقہ ان کے اس انداز سے (جس کا ذکر عرشی صاحب نے کیا ہے اور جو یقیناً اندازِ معشوقانہ نہیں کہلایا جا سکتا) ان کی قابلیت و قوت استدلال کی نسبت کوئی اچھی رائے قایم نہیں کر سکتا۔

علاوہ اس کے یوں بھی خود عہد سعادت اور قرون اولیٰ کی تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ اور ان کے اصحاب نے کبھی اپنے معترض و دشمن کے جواب میں خشونت سے کام نہیں لیا، بلکہ برعکس اس کے ان کی لینت و نرمی اور زیادہ ہو گئی پھر جبکہ ہمارے علماء کی یہ خشونتیں اور خشکیاں، مذہب و عقل دونوں کے نزدیک مردود ہیں تو وہ ان کے مظاہرہ سے کیا فایدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ میں نے جنوری کی اشاعت میں کافی تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا ہے کہ میں علماء کی طرف سے کس لب و لہجہ میں جواب چاہتا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ۔۔ اگر انھوں نے متانت و سنجیدگی سے کام نہ لیا تو کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوگا اور ایسے جواب سے جواب نہ دینا ہی بہتر ہے۔

---

[1] اس نام سے جواب دینے میں ہمارے بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی بری الذمہ ہیں جس کی تفصیل آیندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی۔

میں سرسری طور پر اپنا خیال ٹسڈل کی اس کتاب کے متعلق جنوری کی اشاعت میں ظاہر کر چکا ہوں اور آئندہ اشاعت میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ زمانہ کی موجودہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر، مذہب کی صحیح حمایت کن اصول پر کیجا سکتی ہے اور کن مسایل کو کن کن نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

کیا جنگ واقعی ختم ہو رہی ہے

اس وقت جنگ کا جو نقشہ پیش نظر ہے، اس کو دیکھ کر بہ آسانی ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ لڑائی اب اس منزل پر پہونچ گئی ہے، جہاں سے اس کے رُخ پلٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں اور جرمنی کی نازی قوت اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو ایک طویل زمانہ تک اب سر نہیں اُٹھا سکتی۔ جنوب اور مغرب کی طرف سے امریکی و انگریزی فوجوں کا یلغار، مشرق اور شمال کی جانب سے روسی افواج کا زبردست اقدام، جرمنی کے لئے اس شکنجہ کو روز بہ روز تنگ کرتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب سوال یہ نہیں ہے کہ برلن میں داخلہ ممکن ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ کہ وہاں کے ایوان حکومت پر سب سے پہلے روس کا جھنڈا لہرائے گا یا امریکہ و برطانیہ کا اور یہ امر اس حد تک یقینی سمجھ لیا گیا ہے کہ نہ صرف جرمنی کے تقسیم و تجزیہ کا پروگرام مرتب ہو چکا ہے، بلکہ تمام بلقان و وسط یورپ کے جغرافیہ و سیاست میں جو تبدیلیاں ہونے والی ہیں، ان پر بھی یالٹا کانفرنس میں کافی بحث ہو چکی ہے۔

پھر ان حالات میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ جنگ ختم ہونے والی نہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس جنگ کا اختتام اتحادیوں کی کامیابی پر نہ ہوگا لیکن باوجود اس علم و یقین کے، یہ امر ہنوز مشتبہ ہے کہ اس جنگ کے بعد واقعی دنیا کو امن و سکون میسر آجائے گا اور جنگ کے بعد کا معاشی، اقتصادی اور سیاسی اضطراب ایک اور تیسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت نہ ہوگا۔

دُنیا کی ہر لڑائی میں مختلف قوموں کے تصادم سے ہمیشہ زمانہ کی رفتار اور لوگوں کے میلان و رجحان میں بڑا اثر پڑا ہے اور دنیا کی ہر جنگ اپنی ضرب سے کوئی نہ کوئی نیا زاویۂ حیات انسانی میں پیدا کر جاتی ہے، لیکن یہ لڑائی اس حیثیت سے ہمیشہ ممتاز سمجھی جائے گی کہ اس نے ایک ایسے زاویۂ نگاہ کو حقیقت ثابت کر کے دکھا دیا جسے دنیا اسوقت تک محض فرضی، وہمی اور خیالی نقطہ سمجھتی آ رہی تھی۔

قدیم زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوتی تھیں، ان میں صرف قوت اور عسکری نظام کا امتحان ہوتا تھا اور یہ تجربہ صرف شکست یا فتح کی صورت میں ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن اس زمانہ کی لڑائیاں وہ آگ ہیں جن پر انسانی تصورات و نظریات بھی پرکھے جاتے ہیں، سیاست و مذہب کے اُصول بھی جانچے جاتے ہیں اور پھر انھیں پر مستقبل کا نظام قایم ہوتا ہے۔ اس لئے موجودہ جنگ کی اہمیت کا اندازہ جرمنی کی شکست سے نہ کرنا چاہیئے بلکہ روس کی کامیابی سے یعنی کسی اور قوم کے لئے یہ جنگ چاہے جیسی ثابت ہو، لیکن روس اور اس کی حکومت کے لئے یقیناً رحمت بنکر آئی اور اشتراکیت کو اتنا اہم بنا گئی کہ دُنیا کا کوئی نیا نظام اس کو جگہ دئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اور یہ سرمایہ دارانہ اُصول پر قایم ہونے والی حکومتوں کے لئے اتنا تلخ نوش ہے کہ منھ بگاڑے بغیر وہ حلق سے نیچے اُتر نہیں سکتا اور اگر یہ نوش ہضم نہ ہو سکا تو دنیا میں پھر

اک بار پھر زلزلہ آنا ہے اور شاید اس سے زیادہ سخت، اس سے زیادہ تباہ کن!

یہی ہے وہ اندیشہ جو بعض اصحاب فکر کو اس جنگ کے نتیجہ کی طرف سے غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے اور بار بار یہی سوال ان کے سامنے آتا ہے کہ کیا جنگ واقعی ختم ہونے والی ہے!

اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نازی حکومت کے ختم کرنے کا تعلق ہے، روس، برطانیہ اور امریکہ، تینوں بغیر ادنیٰ اختلاف کے متحد الخیال ہیں، لیکن نازیت کے ختم ہونے کے بعد وسط یورپ اور بلقان کی حکومتوں کا کیا حشر ہوگا، پولینڈ، ترکی، ایران اور بالٹک کی ریاستوں کی تنظیم کس طرح ہوگی اور اس سے زیادہ یہ کہ خود جرمنی میں کس نوع کی حکومت قایم ہوگی، یہ وہ مسایل ہیں جن کے متعلق اب تک کوئی مفاہمت نہیں ہوسکی اور اس چھتہ کو چھیڑتے ہوئے، اتحادیوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ کانپ اُٹھتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس وقت مصالح جنگ نے امریکہ و برطانیہ کو روس کے ساتھ متحد کر دیا ہے، ورنہ یوں اُصولاً ان میں باہمی اتحاد کی کوئی صورت نہیں۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں جمہوری حکومت ہونے کی مدعی ہیں اور جمہوریت ہی ان کا نصب العین ہے، برخلاف اس کے روس اشتراکیت کا حامی ہے جسے امریکی یا برطانوی جمہوریت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

بظاہر ان دونوں میں تصادم کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، جبکہ ایک طرف اسٹالین کہہ چکا ہے کہ دوسرے ملکوں کو اشتراکی بنانا اس کا مقصود نہیں، اور دوسری طرف امریکہ و برطانیہ بھی یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ہر ملک کو اپنی حکومت کی تعیین کا اختیار حاصل ہوگا لیکن اندرونی طور پر صورت حال مختلف ہے اور خصوصیت کے ساتھ روس کی پالیسی سے "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا ہو چلے ہیں۔

خود جرمنی سے متعلق روس کی پالیسی اتنی لچیلی ہے کہ اگر آج نازی حکومت ختم ہو جائے اور اہل جرمنی کو انتخاب حکومت کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ سوویٹ حکومت پر غور کئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔ آپ کو شاید یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ خود جرمن افسروں کی ایک یونین اس وقت ماسکو میں قایم ہے جو ریڈیو پر جرمن پبلک کو مخاطب کرتی رہتی ہے۔

بلقان میں جس خوبصورتی کے ساتھ روس اپنے اثرات قایم کر رہا ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ جس وقت روس کو معلوم ہوا کہ بلغاریا مغربی حکومتوں کے ساتھ شامل ہونے پر مایل ہے تو اس نے بلغاریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ التوائے جنگ کی بات چیت جو قاہرہ میں ہو رہی تھی، ماسکو میں ہونے لگی۔

رومانیا میں روس نے اپنے اثرات جیسے اور جس طرح قایم کر لئے ہیں وہ بھی سب پر واضح ہیں کیونکہ روس کے شرائط رومانیا کے لئے اتنے دلکش ہیں کہ وہ ان کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا اور اسی لئے بخارسٹ میں سوویٹ رسوخ بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح آسٹریا، ہنگری، یوگوسلیویا، سربیا اور یونان ہر جگہ روس کی اندرونی ریشہ دوانیاں

اس کے لئے بڑی کامیاب ثابت ہو رہی ہیں اور پولینڈ کے باب میں روس کا مطالبۂ کرزن لائن تو خود برطانیہ کو بھی ماننا پڑا۔

پھر ان حقیقتوں سے برطانیہ و امریکہ ہی نہیں بلکہ جاپان بھی اچھی طرح واقف ہے اور اسی لئے اس دوران میں اس نے ہٹلر سے برابر یہی کہا کہ "لڑائی تو تم ہار چکے ہو اس لئے اس کا انجام ہی چننے کی کوشش کرو اور وہ یہ کہ روس کو ہر ممکن رعایت دیکر، "برلن، ماسکو اور ٹوکیو" کا ایک نیا محور قایم کرلو"۔ لیکن جاپان کو یا تو ہٹلر کی ذہنیت کا حال معلوم نہیں یا وہ خود اسٹالین کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا، ورنہ وہ یہ خواہش ظاہر نہ کرتا۔

بہرحال جنگ کے اختتام کا زمانہ جتنا قریب آتا جارہا ہے، مستقبل کے متعلق اتنی ہی زیادہ فکریں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور اگر خدانخواستہ جمہوریت و اشتراکیت کی اس اندرونی کشمکش نے زیادہ نازک صورت اختیار کرلی اور یہ چنگاری سینوں سے نکلکر دامن تک پہونچ گئی تو پھر اس آگ کا بجھنا آسان نہیں۔

اس دوران میں یہ خبر بھی آئی ہے کہ ترکی نے نازی محور کے خلاف اعلان جنگ کردیا ہے، ظاہر ہے کہ ترکی کے اس اعلان کا اثر جنگ پر کچھ نہیں پڑ سکتا اور شاید اسی چیز کو "مشت بعد از جنگ" کہتے ہیں، لیکن اگر اس اعلان کے بعد کم از کم اتنا بھی ہو سکا کہ "صلح کانفرنس" جس میں اسے اس اعلان کے بعد شرکت کا حق حاصل ہوگیا ہے) اُس سے کچھ چھین نہ سکی (لطف وعطا کا ذکر نہیں) تو بھی ہم اسے غنیمت سمجھیں گے — جاپان گو ابھی تک جنگ کر رہا ہے، لیکن اس یقین کے ساتھ کہ اسکا بھی وہی حشر ہونا ہے جو جرمنی کا ہونے والا ہے، لیکن جس طرح جرمنی ابھی تک اس امید پر جی رہا ہے کہ شاید اتحادیوں کی آپس کی پھوٹ سے وہ فایدہ اُٹھا سکے، اسی طرح جاپان بھی توقع قایم کئے ہوئے ہے، لیکن یہ دونوں اس حقیقت سے بیخبر ہیں کہ اتحادیوں کا اختلاف بھی اب ان کی قسمت کے فیصلہ کو رد نہیں کرسکتا اور انھیں یہ فیصلہ بہرنوع ماننا پڑے گا۔

بہ سلسلۂ صفحۂ ۶۳ (مطبوعات موصولہ)

اقبال جناب مجنوں گورکھپوری کا اجمالی تبصرہ ہے اقبال کی شاعری پر جسے ایوان اشاعت گورکھپور نے شایع کیا ہے۔

اقبال پر اسوقت تک جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس میں کمیت کے لحاظ سے تو کسی اضافہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، لیکن کیفیت کے لحاظ سے اس میں ابھی بڑی گنجایش باقی ہے — اقبال کے مطالعہ کے سلسلہ میں عام طور پر لوگ یہ غلطی کیا کرتے ہیں کہ انکی شاعری اور مقصود شاعری کو ایک دوسرے سے متمایز نہیں کرتے۔ پہلے یہ یقین کرلیا جاتا ہے کہ وہ فلسفی تھے اور فلسفی بھی ایسے جن سے کسی غلطی کا ہونا ممکن نہیں اور پھر وہ انکے کلام سے انھیں ایسا ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بڑی اُصولی غلطی ہے۔

جناب مجنوں نے اس رسالہ میں اقبال کی ان دونوں خصوصیات کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کرکے رائے زنی کی ہے اور انکی شاعرانہ و فلسفیانہ دونوں حیثیتوں کے حدود متعین کرکے بتایا ہے کہ مفکر ہونے کی حیثیت سے وہ کیا تھے اور شاعر ہونے کے لحاظ سے انکا کیا مرتبہ تھا۔ اقبال کے خیالات میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ بڑے اُلجھن کی چیز ہے اور اسکے حقیقی اسباب کا پتہ چلانا آسان نہیں لیکن جناب مجنوں نے اس فرض کو بھی بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں یہ رسالہ اپنی خصوصیت سب سے علٰحدہ رکھتا ہے۔ قیمت بارہ آنے اور طباعت و کتابت نہایت پسندیدہ

ترقی پسند شاعری

اگر آپ اپنی پرانی تاریخ کا جایزہ لیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کا زمانہ ذہنی، معاشرتی، مذہبی اور اقتصادی اعتبار سے بڑا پُر آشوب گزرا ہے۔ پُرانی قدروں کے ایوان میں زلزلے کے سے جھٹکے محسوس ہوئے ہیں، نئے تصورات کی بنیادوں پر زندگی کی نئی تعمیر شروع کی گئی ہے اور اگرچہ آنے والی صبح کے آثار ابھی دھندلکے میں ہیں لیکن یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریک رات کا بڑا حصّہ گزر چکا ہے اور انقلاب کی جس درخشاں صبح سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں ادب بھی اس کا ایک پہلو ہے۔

یہ سُنکر آپ کو غالباً بالکل تعجب نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے علاوہ اور ملکوں کا ادب بھی تجربہ اور انقلاب کی آزمایش سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ یہاں میں مختصر طور پر اُن تجربوں کا ذکر کروں گا جو انگریزی شعر و ادب میں کئے گئے اور جن سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے نوجوان شعرا متاثر ہوئے ہیں اس طور پر آپ کے سامنے وہ پس منظر آجائے گا جس میں ہمیں اُردو کی موجودہ ترقی پسند شاعری کو دیکھنا ہے

پچھلے چالیس سال کی مختصر مدت میں انگریزی شاعری میں کئی رجحانات ملتے ہیں۔ ابتدائی وکٹوریائی عہد کے شعرا کے کلام کا ایک نمایاں عنصر اُن کی رجائیت تھی اور اس عہد کے آخری شعرا بالخصوص جیمس تامسن، تامس ہارڈی اور ہاؤس مین تھے تامسن زندگی کے آلام اور مصائب کو محسوس کر کے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، ہارڈی انسان کی مصیبتوں پر غور کرتے کرتے اُس کے خالق پر بھی سوچنے لگتا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ انسان کا احساس اُس کے حق میں مصیبت ہے کیونکہ یہی اُس کے مصائب کا سرچشمہ ہے۔ ہاؤس مین کا انداز اُس سے مختلف ہے وہ قانون الٰہی یا انسان کے ساختہ قوانین پر بحث نہیں کرتا بلکہ زندگی سے گھبرا کر اور مایوس ہو کر دیہاتی سکون میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔

اس زوال آمادہ دبستان کے اثرات دوسری صورتوں میں بھی نمودار ہوئے یعنی اخلاق، مذہب اور آرٹ کی مستقل قدریں اپنا اقتدار کھو بیٹھیں، چنانچہ وائلڈ اور اُس کے ساتھیوں نے سوئن برن کی مثالوں کو سامنے رکھکر عجیب عجیب ارواح اور اعمالِ خبیثہ کا مطالعہ کیا۔

یہی زمانہ ہنلے نے پایا۔ اُس نے شاعری میں انقلاب کی ضرورت کو محسوس کیا، اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ ہمارے ماحول

میں معمولی معمولی چیزیں ایسے نقوش پیدا کر سکتی ہیں جو شاعری کا موضوع بن سکیں، اُس نے غیر مقفی نظمیں لکھیں اور چند نئے پیمانے رائج کئے، گبن نے مزدوروں کے طبقہ کو موضوع شاعری بنایا، اور کانوں، کارخانوں اور جہازوں میں کام کرنے والے ادنیٰ مزدوروں کی عورتوں کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا اُنہوں نے انکی بڑی دلخراش حالتیں بیان کیں۔ بے سروسامانی میں بچوں کا پیدا ہونا، بیماریاں، موت، ان نظموں میں اُس کا خاص موضوع ہیں۔ رابرٹ بروک معمولی مناظر سے شدید احساس پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ شاعری میں جماعتی شعور ضرور پیدا ہو۔

ٹکنیک کے اعتبار سے جس دور کی شاعری کا میں اسوقت ذکر کر رہا ہوں بہت اہم ہے۔ نظم کی پُرانی بندشوں کو توڑ کر یہ کوشش کی گئی کہ نظم روانی اور بیان میں عام گفتگو سے زیادہ قریب آجائے۔

اسکے بعد کے شاعر اپنے خاص رجحانات کی بنا پر (Imagists) کہلاتے ہیں۔ ان کے چار اُصول تھے:

(۱) موضوع کا براہ راست بیان (۲) مختصر الفاظ (۳) خاص تصورات سے مدد لینا (۴) فطری وزن۔ اسی زمانہ میں انگریزی شاعری نے جاپانی اور چینی شاعری سے بھی بعض چیزیں اخذ کیں اور آزاد نظم عام طور پر رائج ہوگئی، اس تحریک سے متاثر ہونے والوں میں ہیوم بھی تھا، اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ عصر حاضر کی زندگی نے انسان اور فطرت کی ہم آہنگی کو بالکل برباد کر دیا ہے یہ بھی تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتا ہے لیکن ہر موقع پر اس کا بیان صاف رہتا ہے۔ قوافی کے اُصولوں کی سختی کو انھوں نے ترک کرنا چاہا لیکن قبل اس کے کہ یہ تحریک عام طور پر اپنی خوبیوں کو ظاہر کر سکے کچھ نومشق شاعروں نے اسے اختیار کر لیا اور اسے نیم پختہ اور بے ربط خیالات کے اظہار کا اک آسان ذریعہ سمجھ کر استعمال کرنے لگے اگر آپ موجودہ اُردو ترقی پسند شاعری پر نظر ڈالیں تو بالکل یہی کیفیت نظر آئے گی، بعض شعرا نے آزاد نظم کو اُصولی طور پر اختیار کیا ہے لیکن اکثر لوگوں نے جن میں پابند شعر کہنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی جن کے خیالات خام اور جذبات غیر مربوط تھے اسے محض آسان سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔

آلڈنگٹن بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر ہے وہ بھی حالات کا جایزہ لیکر انسانیت اور خود اپنے آپ سے متنفر ہو جاتا ہے آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ن۔م۔ راشد اور چند دوسرے ترقی پسند اُردو شعرا کا بھی یہی انجام ہوا ہے۔

یہ شاعر اپنے تجربے کر رہے تھے کہ جنگ کا آغاز ہوگیا اور اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا، جنگ کی وجہ سے سوسائٹی کی قدریں بدل گئیں اور سوسائٹی کی ضروریات کا احساس اور شدید ہوگیا، نئے اور پُرانے اُصولوں میں تصادم ہوا اور ایک تذبذب کی کیفیت پیدا ہوگئی، امن اور استقلال قایم کرنے کی کوشش ایک فطری امر تھا، اس کی بھی دو صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو عہد ماضی میں پناہ لی جائے اور پُرانی تہذیب قدیم معاشرت اور آبائی تصورات دوبارہ رائج کئے جائیں یا ایک نئی دُنیا بنالی جائے۔ انگریزی شاعری میں دونوں کے نمونے ملتے ہیں۔

ان حالات میں ایک اور جماعت شعرا کی آگے بڑھی۔ یہ سب لوگ شہر سے نفرت کرتے ہیں لیکن بعض متقدمین کی طرح فطرت کے دامن میں بھی انھیں پناہ نہیں ملتی، اس لئے وہ آخر کار خود زندگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں،

جنگ نے تقریباً ایسا ہی اثر موجودہ اُردو شعرا پر کیا ہے۔ زندگی سے نفرت، فرار اور آخر خودکشی، انھیں رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ شعرا اس حقیقی دنیا سے فرار اختیار کرکے اپنے خیالات کی ایک شاعرانہ دنیا الگ بناتے ہیں اسی لئے اُنکے کلام میں مبہم تلمیحات اور ناتمام کہانیاں بہت ہیں۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ہماری موجودہ اُردو شاعری بھی بڑی حد تک اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جس طرح مس سٹول کی شاعری میں "موت" کی ہیبت جاری وساری ہے اور ہر ہر قدم پر زندگی کے عبث ہونے کا احساس شدید نظر آتا ہے اسی طرح ہمارے شاعر زندگی کو وبال جان سمجھنے لگے ہیں اور جس طرح یہ انگریزی شعرا میں پہلی مرتبہ نظم کو جدید موسیقی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہیں اسی طرح ہمارے یہاں بھی موجودہ دور میں گیتوں کا عام رواج اسی قسم کی تحریک کہا جاسکتا ہے

آخر میں، میں صرف تین انگریز شاعروں کا اور ذکر کروں گا جن میں سے کم از کم ایک نے ہمارے چند ترقی پسند شعرا کو متاثر کیا ہے۔ میرا مطلب ہربرٹ ریڈ، لارنس اور الیٹ سے ہے، ہربرٹ ریڈ جنگ سے متاثر ہے۔ دنیا سے بیزار ہے محبت پر بھی اُسے اعتبار نہیں کیونکہ اُس کے نزدیک اکثر محبت کا انجام نفرت پر ہوتا ہے، اسی لئے وہ ایک اپنی دنیا بناتا ہے جو خوابوں کی دنیا کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے شاعروں کا بھی یہی محبوب مشغلہ ہے۔ لارنس کی تین خصوصیات قابل لحاظ ہیں:- (۱) اشاریت وابہام (۲) جنسیات (۳) موجودہ نظام سے بیزاری اور اس کی اصلاح یا یہ ممکن نہ ہو تو ایک نئے نظام کی تعمیر اس نظام میں وہ بالعموم مرد عورت اور اس کے جنسی تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے لارنس نے پابند نظمیں لکھیں بعد میں آزاد نظمیں کہنے لگا۔ اُس کے تصورات اُسے 'خودکشی' تک پہونچاتے ہیں۔ اُردو شعرا میں جنسیت اور ابہام اسی طرح ہے جس طرح لارنس کے یہاں ملتا ہے۔ لارنس کی بعض چیزیں جو زیادہ قابل اعتراض تھیں سرکاری حکم سے ممنوع قرار دی گئیں اور اُن کی اشاعت قانوناً بند ہے۔ اُردو شاعروں میں راشد کے یہاں کچھ کچھ اس کی جھلک ملتی ہے لیکن لارنس کی عظمت ابھی راشد کو حاصل نہیں۔ اس تمہید کے بعد میں مقالہ کے اصل موضوع یعنی ترقی پسند شاعری پر آتا ہوں۔

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی، غالباً یہ ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ ہر صورت میں ادب، حیات سے متعلق بلکہ اس کا ترجمان ہے۔ ادب کا وہ دور قدیم جو ادب برائے ادب کا جمالیاتی دور کہا جاتا ہے اُس میں بھی اُس عہد کی تہذیب، اُس کی معاشرت کی دھڑکنیں اور زندگی کی قدریں صاف موجود ہیں، مثال کے لئے صرف میر کے کلام کو دیکھئے اور اب جبکہ ادب برائے زندگی کا تصور ایک تحریک سے گزر کر اُصول بن چکا ہے، اب بھی ادب ہماری پُرآشوب حیات، ہمارے پیچیدہ احساسات اور تفکرات کا مجموعہ ہے، زندگی ہمیشہ زندگی رہی ہے صرف اس کی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ اسی طرح ادب کے بھی موضوعات اور سانچے ہیں، زندگی کی طرح ادب بھی جاندار اور ارتقا پذیری سے پیدا ہوتا ہے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ بڑھتا ہے اور حالات سازگار نہ ہوں تو مر بھی سکتا ہے۔ اپنی زندگی کی ہر منزل میں اس کی وضع قطع تراش خراش علٰحدہ ہوتی ہے۔ یہی ادب کی ترقی ہے

پچھلی جنگِ عظیم ہم میں سے اکثر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، لیکن جنھیں بطور واقعہ یاد نہیں اس کے اثرات جو کم وبیش اس دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز تک باقی تھے انھوں نے بھی ضرور محسوس کئے ہیں، اگرچہ اس عہد کے ادب کے نمونے اب ہمارے یہاں سال خوردہ کہلاتے ہیں تاہم چکبست کا کلام ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی شاعری اس اعتبار سے ادب کی اس زندگی کی پہلی آواز ہے جو ۱۹۱۴ء کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چکبست کا ذکر کرنے سے پہلے اُس کے پس منظر کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جدید کی تعمیر قدیم بنیادوں ہی پر ہو سکتی ہے۔ دراصل حالی سے ہی اُردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور حالی کی شاعری اس دور میں عبوری ادب کا ایک اچھا نمونہ ہے، ایک طرف ان کے دل کی رام کہانی ہے جو وہ اسوقت تک سناتے رہے جب تک ان کا دل زندہ رہا۔ دوسری طرف ان کی وہ شاعری ہے جس میں زندگی کا احساس ایک کروٹ لیتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حالی چونکہ خود پہلے دور کی پیداوار تھے اور ذہنی تصورات و محسوسات کے ساتھ شعری پیمانے بھی انھیں وہی پسند تھے جو وہ بچپن سے دیکھتے چلے آئے تھے اس لئے وہ اس نئے ادب کے دور کی صرف ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکے، یہ ان کی ناکامی ہے یا کامیابی اس کا فیصلہ کرنا آج بہت مشکل ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حالی نے جو کیا اس سے زیادہ کرنا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی، حالی میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ان لوگوں میں رہ کر جو "سرگشتۂ خمار رسوم و قیود" تھے انھوں نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُن پابندیوں کو توڑنے کا پہلا اعلان کیا، اسوقت تک ہماری شاعری کا فن یا ٹکنیک جیسا دقیق اور اُصولی بن چکا تھا، اس کا اعادہ ضروری نہیں۔ وزن۔ ردیف قافیہ ایسے پیمانے تھے جن کے سوا اور پیمانوں میں شرابِ سخن چھلکائی نہیں جا سکتی تھی۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جس دن حالی نے یہ اعلان کیا کہ وزن شعر کے لئے کوئی ضروری شرط نہیں اور قافیہ بھی اگرچہ شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے اس کے لوازم میں نہیں بلکہ اچھے شعر میں صرف سادگی اصلیت اور جوش کا ہونا کافی ہے، اس دن گویا قدیم شاعری کے قصر کو جس میں اُردو شعرا کی تین سو سالہ تعمیری کوششیں شامل تھیں، تخریب کے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس ہوا جس سے اُس میں بعض شگاف پیدا ہو گئے اور انھیں شگافوں میں سے مستقبل کی شاعری کا نور چھن چھن کر آنے لگا، لیکن پوری عمارت کو گرانے کے لئے اور زلزلوں کی ضرورت تھی اور نئی عمارت کی تعمیر ابھی نئے معماروں کے انتظار میں تھی۔ ان نئے معماروں میں معمارِ اعظم اقبال تھا۔

اقبال کے مفکرانہ نظریے اور ان کی اسلامی شاعری لوگوں کو اُن کے اہم ترین کارنامے نظر آتے ہیں لیکن ادب کی تاریخ میں ان کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں انقلابی اور ترقی پسند تھے۔ بیداریٔ جمہور کی خاطر وہ ہر نقشِ کہن مٹانے کو طیار تھے۔ اُن سے پہلے شاعری نفی حیات اور ہزیمت خوردہ ذہنیت کی شاعری تھی، انھوں نے اثبات حیات اور رجائیت کی شاعری کا آغاز کیا، اُن سے پہلے شعر و ادب میں فرشتے اور سلاطین ہی تھے انھوں نے شیطان اور مزدور کو بھی ایوانِ شاعری میں داخل ہونے کی اجازت دی اور ان سب باتوں میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے نہ اُن کے جذبات ہنگامی تھے اسی لئے اُن کے کلام میں گہرائی اور ابدیت ہے، لیکن اقبال اس انقلاب کے صرف نقیب تھے جو آگے آنے والا تھا ان کی ترقی پسندی اُن کے

موضوعات اور تصورات تک محدود ہے، وہ خود اپنی شاعری میں مروجہ اور سکہ بند اصناف سے آزادی حاصل نہ کر سکے، یہ آزادی اُن کے لئے دشوار بھی تھی، شاعری کی ابتدا کی تو داغ کے شاگرد ہوئے جو غزل کے بادشاہ تھے۔ غزل اصناف سخن میں قاعدوں اور اُصولوں کی پابندی کی ایک انتہائی شکل ہے، اقبال نے مدتوں اسی پیمانے میں مشق کی، آخر میں غزلیں کم ہو گئیں، ان کی جگہ مکمل اور مسلسل نظمیں زیادہ آگئیں لیکن قافیہ اور وزن کی احتیاط جو قدامت سے ورثہ میں ملی تھی قایم رہی۔

تکنیک کے لحاظ سے پہلے ترقی پسندوں میں عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی کے نام زیادہ مشہور ہیں ان دونوں نے اُردو میں پہلی مرتبہ غیر مقفیٰ نظم لکھنے کی کوشش کی اور چند نمونے پیش کئے۔ لیکن ان دونوں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ اسے ایک تحریک بنا سکیں، انھوں نے ایک تجربہ کیا اور بس، یہ تجربہ ایک تحریک تو کیا ایک ہیجان بھی نہ بن سکا۔ کیونکہ شرر اور اسمٰعیل سے لیکر عرصہ تک لوگوں کے خیالات آنے والے دور کے لئے طیار ہوتے گئے۔ چنانچہ مولانا شبلی بھی جو پرانی وضع کے بزرگ تھے اور خود اپنی شاعری میں متقدمین کی تقلید کرتے تھے اس سے نہ بچ سکے، انھوں نے شعر العجم میں جہاں شاعری کی ماہیت سے بحث کی ہے وہاں انھیں خیالات کا اعادہ کیا ہے جو حالی کے یہاں ملتے ہیں یعنی وزن اور قافیہ کو شعر کی ضروری شرط قرار نہیں دیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ترقی پسندی کے آثار ہیں لیکن عملاً ترقی پسند شاعری اس کے بہت بعد شروع ہوئی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم بھی نئی شاعری کے نقیب تھے انھوں نے اُردو عروض کو ہندی پنگل سے قریب تر کرنے کی سعی کی۔ گیت لکھے اور بعض نئے شعری پیمانے ان میں رائج کئے۔ اُن کی تصنیف میں سُریلے بول اسی نئی تحریک کی ایک آواز ہے۔

ترقی پسند شاعری کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن اس تحریک کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ۱۹۳۶ء میں چند نوجوانوں نے ترقی پسند ادب کے نام سے شروع کی تھی، اس تحریک کا پہلا ادبی اعلان وہ مشہور بدنام مجموعہ ہے جو "انگارے" کے نام سے موسوم تھا، اس تحریک میں پہلے پہلے سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ کے نام نمایاں رہے، احمد علی کا مجموعہ "شعلے" بھی اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے "انگارے" کا جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے، پرانی چال کے ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا۔ رجعت پسندوں نے بڑی لے دے کی اور آخر کار کتاب سرکار نے ضبط کر لی۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک اس تحریک نے اپنی عمر کے سات سال گزارے لیکن اس میں زیادہ تر نام اُن لوگوں کے ہیں جن کی ادبی زندگی ۱۹۳۶ء سے پہلے شروع ہو چکی تھی ۱۹۳۶ء میں یہ ہوا کہ وہ لوگ جو منتشر طور پر علٰحدہ علٰحدہ تجربے کر رہے تھے انھیں ایک زاویہ اور ایک پلیٹ فارم مل گیا لیکن اس کے باوجود جو مدت ترقی پسند ادب کے تجربے کو گزری ہے بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ترقی پسند مصنفین اپنے اس دور کو بحران کا دور کہتے ہیں اور وہ خود نہیں جانتے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ تاہم پچھلے چند سالوں کے نظم و نثر کے مجموعہ کا مطالعہ کیا جائے تو موضوعات اور ان کے اظہار کے بعض اسالیب خاص رجحانات کی صورت میں نظر آتے ہیں، یہی میرے خیال میں ترقی پسندی کے عام رجحانات ہیں۔

ان عام رجحانات کا جایزہ لینے کے لئے دو چیزیں سامنے رکھنا کافی ہیں، ادبی رسالے اور نظموں کے مجموعے۔ رسالوں

میں ادبی دنیا (لاہور) ادب لطیف (لاہور) ساقی (دہلی) ہمایوں (لاہور) بیشتر اور نگار (لکھنؤ) جامعہ (دہلی) کمتر ترقی پسند شاعری کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ کلام کے مجموعوں میں جوش کے کئی مجموعے ہیں۔ احسان دانش کے چار مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ن۔م راشد کا ماورا، فیض احمد فیض کا نقش فریادی، مجاز کا آہنگ، احمد ندیم قاسمی کی دھڑکنیں، جاں نثار اختر کی سلاسل، اختر الایمان کا گرداب، میراجی کے گیت، ان رجحانات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دو مجموعے ایسے ہیں جن میں بہترین ترقی پسند شاعری کے منتخبات ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کا شایع کردہ مجموعہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں، مکتبۂ اردو لاہور کا شایع کردہ مجموعہ ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کے منتخبات پر نظر ڈالنے سے ۴ خاص رجحانات محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا بڑا حصہ رومانی یا شاعرانہ ہے، جہاں شاعر زندگی سے فرار اختیار کر کے رومان میں پناہ لیتا ہے، دوسرا حصہ سیاسی اور انقلابی ہے جس میں ذہنی۔ سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنے کے جذبات اشتراکی تصورات کے پس منظر میں ملتے ہیں۔ تیسرا رنگ فحاشانہ نظموں کا ہے۔ جن میں سے اکثر میں فحاشی مقصود بالذات ہے اور چند میں عریانی سے کچھ اور مقصد ہے۔ چوتھا رجحان اشاریت یا ابہام کا ہے یعنی ایسے تصورات، اشاروں کنایوں کی شاعری جس میں شاعر کی دنیا اس دنیا سے بہت دور ہے اور اسکی زبان ایک اجنبی زبان معلوم ہوتی ہے، کہیں کہیں ایک آدھ نظم ایسی بھی ملتی ہے جس میں فکر کی گہرائی ہے لیکن یہ اس تحریک کے خاص رجحانات میں نہیں آتی کیونکہ اس کے نمونے نایاب ہیں۔

اِن رجحانات کے مطالعہ کے لئے آپ پہلی قسم یعنی رومانی نظموں میں رات کی بات (مختار صدیقی) نفسیات (عظیم قریشی) تو اگر واپس نہ آتی (جوش) جواب تغافل (عدم) برات (مقبول حسین) ننھا قاصد (اختر شیرانی) دسہرا اشنان (شاد عارفی) حسینہ کی موت (سعید احمد اعجاز) رقص (یوسف ظفر) ۱۹۴۱ء کی نظموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کی نظموں میں اس قسم کی نظمیں 'میں کون ہوں' (ظفر پروین) نومیدی جاوید (راجہ مہدی علی خاں) سعی خام (سعید احمد اعجاز) مہمان (مجاز) تصور کے دھندلکے میں (احتشام) بیزار نگاہیں (جذبی) گلاب (ضیاء جالندھری) آخری سجدہ (احمد ندیم قاسمی) ولولے (یوسف ظفر) یہ کیا (مقبول حسین احمد پوری) طوائف (جذبی) تفاوت راہ (اعجاز بٹالوی) ساتھی (مجید امجد) ایک عورت (سلام مچھلی شہری) کی دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے رجحان یعنی سیاسی انقلابی یا اشتراکی تحریک کی ترجمانی ان نظموں میں ملتی ہے ۱۹۴۱ء میں (۱) انتباہ (فیض احمد فیض) (۲) تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے (مطلبی)۔ (۳) نقشِ پا (اختر الایمان)۔

۱۹۴۲ء میں (۱) اندھیر نگری (شاد عارفی) (۲) دو راہا (ڈاکٹر تاثیر) سیاسی لیڈر کے نام (فیض احمد فیض)

الہامی رجحان دونوں سالوں میں ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر سب کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے نمونے راشد کی خودکشی، زنجیر۔ میراجی کی رخصت اور دھوبی کا گھاٹ، راجہ مہدی علیخاں کی "جنت کی سیر" مخدوم محی الدین کی 'اندھیرا' سلام مچھلی شہری کی 'اندیشہ'

اور 'سات رنگ' میں ملتے ہیں۔

فاحشانہ رنگ میں مخمور جالندھری کی دو نظمیں 'انوکھا بیوپاری' اور 'تالاب'، راشد کی نظم 'انتقام'، شریف کنجاہی کی نظم 'پسپائی'، سلام مچھلی شہری کی 'ڈرائنگ روم' دیکھنے سے اس تحریک کا یہ پہلو نمایاں ہوجاتا ہے، ترقی پسند شعراء میں جوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اُن کے کلام کا ابتدائی حصّہ اگرچہ اپنی صورت کے اعتبار سے نظم کے پُرانے اور مسلمہ اُصولوں کی پابندی میں نظر آتا ہے لیکن شروع سے ان کی توجہ غزل سے زیادہ نظم پر رہی۔ نظم کے موضوعات میں اُن کے ہاں بڑا تنوع ہے۔

مناظر فطرت سے وابستگی کا اظہار، رومان اور انقلاب اُن کی نظموں کے تین اہم عناصر ہیں۔ انقلاب کے پہلے نقیبوں میں جوش بھی ہیں، اُن کے یہاں یہ انقلاب سیاسی، ذہنی، اقتصادی اور مذہبی بیک وقت ہے لیکن اُن کے ہاں اس کی شدت رفتہ رفتہ ہی آئی ہے اور اب اُن کے یہاں ایک کہنہ مشق اُستاد کی پختگی اور توازن نمایاں ہے ایک چیز جو جوش کو ترقی پسند شاعروں میں بڑا مرتبہ دلاتی ہے ان کی "شعریت" ہے۔ اگر رومان اور شعریت جوش کی شاعری کے ترکیبی عناصر نہ ہوتے تو شاید ان کا ذکر اس سلسلہ میں سب سے پہلے نہ آتا، اُن کے یہاں الہام یا اشاریت جو اکثر ترقی پسند اپنا طرۂ امتیاز بنائے ہوئے ہیں بالکل نہیں عریانی بھی جوش کے یہاں مقصود بالذات نہیں، البتہ مذہب اور اُس کے متعلقات میں جوش نے ایک رندِ لاابالی کی بیباکی اور جسارت کا اظہار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے شوخی اقبال کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اُس سے اقبال کا مقصد انسان کی برتری اور اُس کی خودی کی عظمت کا احساس ہے۔ جوش کے یہاں تضحیک اور استہزاء ہے، لیکن جوش کی ابتدائی شاعری میں یہ عناصر نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے موجودہ ماحول اور اُن کے متوسلین نے اس بارہ میں انھیں زیادہ متاثر کیا ہے، جوش یوں بھی اپنی عمر کی اس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں قوت ارادی ضعیف ہوجاتی ہے، کیا تعجب ہے کہ جوش کا یہ رنگ بھی اسی کمزوری کی علامت ہو، جوش کی شاعری انقلابی ہونے کے باوجود شعر و ادب میں متقدمین کی عظمت کی قائل ہے۔ اگر نوجوان ترقی پسند اس پیر مغاں سے قدامت کی عظمت بھی سیکھ لیں تو ان کی بہت سی خامیاں دور ہوجائیں۔

پنجاب کے رسالوں اور شاعروں کا ذکر آنے سے آپ نے محسوس کرلیا ہوگا کہ ترقی پسند شاعری میں زندہ دلان پنجاب کا بڑا حصّہ ہے۔ پنجاب میں جو نام اس سلسلہ میں سب سے پہلے ملتے ہیں وہ تاثیر اور عابد علی کے ہیں۔ تاثیر پہلے غزلیں کہتے تھے، پھر گیت کہنے لگے، گیتوں میں محبت کے راگ کے ساتھ روٹی اور بھوک کے مسائل بھی آنے لگے، دہقان کا مستقبل، مزدور کا گیت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ محبت کے گیتوں میں تم بھی پیت کرو تو جانو، اور رومان بھی جاؤ جانے بھی دو، اچھے رومانی گیت ہیں، لیکن شاعری کے ٹکنیک میں تاثیر نے اُس وقت کوئی خاص اضافہ نہیں کیا، اور غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۲ء تک نظم غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کا رواج عام نہ ہوسکا، کاروان کے سالناموں میں پہلی مرتبہ اس قسم کے بعض تجربے پھر نظر آئے۔

بعض اور نوجوان ترقی پسند شاعروں کا ذکر کرنے سے پہلے میں احسان دانش کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اشتراکی شاعری

ترقی پسند شاعری کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ احسان بھی بڑی حد تک اشتراکی شاعر ہے، لیکن اس کی اشتراکیت 'ڈرائنگ روم' کی اشتراکیت نہیں، اور نہ زمانے کے فیشن یا ترقی پسندی کے نشان کے طور پر ہے، وہ ایک مزدور تھا اور اگرچہ اپنی جد و جہد سے اس نے اپنی زندگی کو ہموار بنانے میں کچھ کامیابی حاصل کرلی ہے، تاہم اُس کی کشمکش جماعت کی کشمکش کے ساتھ اب تک جاری ہے وہ صحیح معنوں میں مزدوروں کا کامریڈ ہے اُس نے مزدوروں کے ساتھ کام کیا ہے، اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوا ہے اس لئے اس کے خیالات کارل مارکس، لینن اور اسٹالین کی بحثوں سے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُن کا منبع خود اس کا تجربہ احساس اور تجزیہ ہے اس لئے خلوص کی جو بو باس اس کے یہاں ہے وہ اُس کے معاصرین میں سے اور کسی کو نصیب نہیں اس اعتبار سے میرے خیال میں ترقی پسند شاعری کے اشتراکی پہلو کا سب سے اچھا ترجمان احسان ہے۔ وہ بہت سے عیبوں سے بھی پاک ہے۔ اس کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی شدت نہیں، اُس کے خیالات سطحی اور جذبات ہنگامی نہیں، اُس کی شاعری اُس کے شدید احساس کی پیداوار ہے، اُس کے یہاں عریانی نہیں۔ زندگی سے فرار نہیں وہ ٹکنیک کے نئے اور پُرانے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا نہ اپنے کلام کو مبہم اشاروں اور دور از کار کنایوں سے چیستان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شاعری اُس کی شدید قوت حاسہ کا آزادانہ اور برجستہ اظہار ہے۔

اب بعض اور ترقی پسندوں کو لیجئے۔ پہلا نام فیض کا سامنے آتا ہے۔ وہ ترقی پسندی کی رو میں غیر ارادی طور پر نہیں بہہ گیا ہے بلکہ اس نے شاعری کے موضوعات اور ٹکنیک پر غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے اسی لئے اس کے کلام میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو سطحی ہیجانات یا وقتی جذبات کی بجائے گہرے احساسات سے وابستہ ہیں اور اسی لئے اُن میں دیرپا ہونے کی صلاحیت ہے فیض کی ابتدائی شاعری میں رومان اور ٹکنیک میں پابندی نظر آتی ہے لیکن بہت جلد وہ زندگی کی اُلجھنوں میں گرفتار نظر آتا ہے، اس کے رومان کی دنیا ویران ہوتی معلوم ہوتی ہے لیکن محبت کا اب بھی اس پر غلبہ ہے، ایک مشہور نظم کا عنوان "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" ہے۔ لیکن تلخ حقائق رومان کی دنیا میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ فیض کا موضوع سخن محبت کے سوا اور چیزوں کا بھی احاطہ کرتا ہے، موضوع سخن کے عنوان سے فیض نے ایک نظم لکھی ہے:

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے — آدم و حوّا کی اولاد پہ گزرا کیا ہے!
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی ہے — ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

دنیا کے ان آلام اور مصائب سے گھبرا کر فیض محبت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ انگریزی شاعروں میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اکثر نے یہی راہ فرار اختیار کی ہے، لیکن فیض کے لئے غم روزگار کی تلخی وہاں بھی کم نہیں ہوتی۔

ٹکنیک کے اعتبار سے اب فیض میں تبدیلی آتی جارہی ہے۔ غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس ٹکڑے سے آپ اُس کے موجودہ موضوعات اور ٹکنیک دونوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں — سیاسی لیڈر کے نام:

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ — رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز — جس طرح تیتری کہسار پر یلغار کرے
اور اب رات کے رنگین و سیہ سینے میں — اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے — دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

ظلمت شب میں امید کی کرن کا یہ وہی فلسفہ ہے جس کی پہلی جھلک اقبال نے دکھائی تھی اپنی ایک اور نظم "انتباہ" میں بھی فیض اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔

فیض کا یہ رنگ اپنے ساتھی راشد سے مختلف ہے جس کے یہاں انجام کار خودکشی پر ختم ہوتا ہے۔ فیض کے ساتھ راشد کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ ترقی پسندوں میں سب سے بڑا ترقی پسند ہے کیونکہ موجودہ نظام سے بیزاری اُسکی شاعری کی روح ہے۔ اسی نظام کی بدولت وہ بھی فیض کی طرح رومان میں پناہ ڈھونڈھتا ہے لیکن زندگی کا کھٹکا وہاں بھی لگا رہتا ہے اُس کی نظم 'رقاصہ' کو دیکھئے:

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے — زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو — رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ کر مجھ کو نشاں پالے مرا — اور جرم عیش کرتے دیکھ لے
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے ایک خونیں بھیڑیئے سے کم نہیں

راشد کی ابتدائی نظموں میں انسان پہلا سانیٹ ہے جس میں اشتراکی خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ دوسرے سانیٹ کا عنوان خواب کی بستی ہے۔ تیسرے سانیٹ کا عنوان ستارہ ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے:

کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حُسن و لطافت ہو — کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

اس ذہنی کشمکش اور اضطراب میں گھبرا کر راشد مذہب کے تصورات کی زنجیروں کو بھی توڑ دیتا ہے، اس ذہنیت کے ترجمان چند شعر یہ ہیں:

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے — اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں — ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ——— اُداس — (دریچے کے قریب)
تین سو سال کی ذلت کا نشاں — ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی،

گناہ کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں:

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا — بے بسی میرے خداوند کی تھی

جن حضرات نے اقبال کی نظم "مکالمۂ جبریل و ابلیس یا ابلیس کی مجلس شوریٰ" پڑھی ہے وہ اس کا مقابلہ راشد کے ان مصرعوں سے کریں، صرف یہی ایک نکتہ راشد کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک اور نظم "اتفاقات" ہے۔ اس کے دو مصرعے یہ ہیں:

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

یا 'انسان' کے عنوان والی نظم میں:

کسی سے دور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا خدا سے بھی علاج درد انساں ہو نہیں سکتا

مذہب کے بارہ میں اپنے ان خیالات کی وضاحت راشد نے اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے:

"مذہب کی تخفیف مقصود نہیں لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے مذہب نے ہماری انفرادیت کو غیر ضروری حد تک صدمہ پہونچایا ہے اور خود فکری کے اس نایاب جوہر کو جو ادبیات اور تہذیب کے فروغ اور ترقی کے لئے ضروری ہے آہستہ آہستہ محدود کر دیا ہے۔"

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہر طرف سے بیزار ہو کر راشد فرار اختیار کرتے ہیں، اور دو چیزوں میں پناہ لیتے ہیں 'شراب' اور 'عورت' "مے سے غرض نشاط" متقدمین کو بھی نہ تھی وہ اسے ایک 'گونہ بیخودی' کے لئے ہی چاہتے تھے، 'عورت' البتہ ان کے اعصاب پر سوار نہ تھی راشد کی جن نظموں میں 'عورت' سوار ہے وہ خاص طور پر یہ ہیں۔ (۱) ہونٹوں کا لمس (۲) ایک رات (۳) دریچے کے قریب (۴) رقص (۵) انتقام (۶) آخر الذکر نظم میں ایک نیا فلسفہ ہے۔ نظم کا آخری حصہ یہ ہے:

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے ہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے لبی کا انتقام

اس ذہنی خلفشار کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جب شراب اور عورت بھی شاعر کے غم کو بھلا نہیں سکتے تو وہ خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے "خودکشی" اُن کے مجموعے کی آخری نظم ہے۔

ٹکنیک کے بارہ میں راشد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ 'ماورا' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

(۱) "میری رائے میں جہاں تک ٹکنیک کی قیود کی متعصبانہ حمایت ایک فرسودہ قدامت پرستی کی دلیل ہے وہاں اس کے خلاف مجنونانہ احتجاج بہت بڑی حد تک بے راہ روی کے مترادف ہے۔ جو لوگ شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ ندرت پرستی کے جوش میں نہ صرف توانی اور بچوری کی تعمیری حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ اُن کو منسوخ کر کے اُن کے

نقصان کی تلافی کسی بہتر یا نئی چیز سے کرنا بھی نہیں جانتے ..... قدیم اسالیب بیان کا ادنیٰ باغی ہونے کے باوجود میرے نزدیک یہ اعتراض قابل پذیرائی نہیں کہ بحروں اور قافیوں کی پابندی شاعری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے..... اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کسی حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار ہے۔"

اس حیثیت سے راشد کے مجموعے کو دیکھا جائے تو اس میں باقاعدہ نظمیں، سانیٹ اور غیر مقفیٰ سب شامل ہیں لیکن بالکل آزاد اور بے اصولی کے اصول کی مثالیں راشد کے یہاں نہیں ملتیں۔ اسی لئے اس کا ایک ٹکنیک اس کا اپنا ہے، جس میں عام نوجوان ترقی پسندوں کی بے راہ روی نہیں ہے جو غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کو اظہار کا ایک سستا اور آسان ذریعہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے، اگر نئی شاعری میں کچھ جاندار چیزیں ہیں تو وہ فیض اور راشد ہی کے یہاں ہیں۔

فیض اور راشد کے بعد مجاز کو لیجئے، اُن کے یہاں بھی پہلے رومان اور خالص رومان ہے رفتہ رفتہ اشتراکی خیالات آئے ہیں۔ لیکن رومان اب بھی جوش کی طرح مجاز کی شاعری کی جان ہے 'نذر دل'، 'مجبوریاں'، 'کس سے محبت ہے'، 'ایک غمگین یاد'، 'اُن کا جشن سالگرہ'، 'نورا نرس کی چارہ گری'، 'ننھی پجارن'، 'آج کی رات'، 'بتانِ حرم'، 'اصنام عشق'، اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ 'ان کا جشن سالگرہ' ان میں اچھی نظم ہے:

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی
ہونٹوں پہ فدا روح بہار گل و نسریں آنکھوں کی چمک رونقِ بزم مہ و پروین،
پیراہنِ زرتار میں اک پیکرِ سیمیں
لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا سہرے میں جھمکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا
ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی خاموشی محجوب میں ایک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزۂ جوانی

"نرس نورا" اُس کی مشہور نظموں میں ہے:

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارا وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ

مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر — یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی — جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چُرالی

مجاز کا یہ رنگ اُس کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ترقی پسندوں میں مجاز اُن چند شاعروں میں ہے جو ابھی تک غزل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ ترقی پسندی کے عام رجحانات بھی مجاز کے یہاں ملتے ہیں۔

'اندھیری رات کا مسافر'، 'ایک سفید پوش رنگریز'، 'نوجوان سے'، 'سرمایہ داری'، 'انقلاب'، 'ہمارا جھنڈا'، 'ایک جلاوطن کی واپسی پر'، 'خوابِ سحر'، 'مزدوروں کا گیت'، 'مہمان'، اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ آخری نظم میں نئی شاعری کی اشاریت کی جھلک بھی موجود ہے 'رات' اور 'ریل' بھی اچھی نظم ہے۔

مجاز زیادہ تر پابند نظمیں لکھتے ہیں۔ الفاظ کی کمی جو اور ترقی پسندوں کے یہاں صاف محسوس ہوتی ہے، مجاز کے یہاں نہیں۔

احمد ندیم قاسمی پُرانے کہنے والوں میں ہیں، اُن کا خاص کلام رومانی ہے۔ ریت کے میدان اور کھجوروں کے درخت ندیم قاسمی کی رومانی دنیا کے نشان ہیں۔ اُن کی محبوبہ گاؤں کی ایک الھڑ بھولی بھالی دوشیزہ ہے۔

احمد ندیم مختصر قطعے لکھتے ہیں جو زیادہ تر اسی رومانی رنگ میں ہوتے ہیں لیکن گاؤں کی پُرسکون فضا میں بھی کبھی کبھی ہنگامے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً:

افق پر دور برفانی پہاڑوں سے اُٹھی بدلی — گزر کر میرے ویراں کھیت پر سے دور جا برسی
کچھ ایسے میں نے دیکھا اس طرح جیسے کوئی مفلس — امیروں کی نگاہِ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی

'محلوں کے سائے'، 'روشنی اور سائے'، 'بھوکوں کے ووٹ'، 'تہذیب کی معراج'، 'مشینوں کا زمانہ'، 'بے چارگی'، 'مجبور مفلس'، 'نوجوان بھکارن'، اسی قسم کے قطعات ہیں ـــ 'گم کردہ راہ'، 'دنیائے خام'، 'کفرانِ نعمت'، نسبتاً طویل نظمیں ہیں جہاں دنیا کے آلام اور مصائب انقلاب کی خواہش ناکامی کا احساس موجود ہے۔ ندیم مذہب کے تصور سے بیزار نہیں، نہ اُسکے یہاں عریانی اور ابہام ہے۔

ایک اور ترقی پسند میراجی ہیں۔ یہ بہت کچھ لکھتے ہیں اور ان کا کلام ادبی دنیا۔ ہمایوں۔ ساقی اور ادبِ لطیف میں اکثر شائع ہوتا رہا ہے لیکن میرے خیال میں یہ راشد اور فیض سے بہت پیچھے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کے یہاں وہ ابہام اور اشاریت زیادہ ہے جو اس دور کے ترقی پسندوں کی ایک عام خامی ہے۔ لیکن میراجی کی یہ خامی ہی اُن کے نزدیک اُن کا فن ہے۔ سُنا گیا ہے کہ میراجی پہلے اپنی نظم لکھ لیتے ہیں اور پھر ہفتوں اپنے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

جنسیات میں بھی میراجی کا یہی رنگ ہے۔ کسی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں میراجی کی ایک نظم کی تشریح کرتے ہوئے

لکھا تھا کہ گوری کو اشنان کرتا دیکھ کر اس کی حسِ شعری اس کے جسم کے کسی متناسب حصّہ سے بیدار نہیں ہوتی بلکہ وہ سب سے پہلے یہی سوچتا ہے کہ وہ آج بھلا کیوں نہائی ؟ ایک اور نظم کا آخری ٹکڑا یہ ہے :

سنتا ہوں شہر کے ایک محلے میں
نفس کی پوجا کرنے والی ایک آوارہ عورت ہے
اور سستا ہے اُس کا کرایہ، ہاں سستے ہیں اس کے دام

اشتراکی خیالات میراجی کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر و کاوش، یا ندیم کی سادگی، یا جوش یا مجاز کی شعریت بالکل نہیں۔

اسوقت اس کا موقع نہیں کہ میں موجودہ ترقی پسند شعرا میں سے سب کا ذکر آپ کے سامنے کر سکوں، لیکن مجھے اُس انگریز پروفیسر کے الفاظ بے ساختہ یاد آتے ہیں جس نے انگلستان کے ایسے شاعروں کی نسبت لکھا تھا کہ "اگرچہ ان شعرا میں دلچسپ کئی ہیں لیکن اچھے چند ہی ہیں، اُن کی مطبوعات کا پڑھنا اُن کی تصنیف سے زیادہ ہمت طلب اور صبر آزما ہے، کیونکہ اُس کا بڑا حصّہ مہمل ہے، اس میں سوائے تکرار کے کچھ نہیں"۔

ان ترقی پسندوں میں سے اکثر نوجوانوں کا یہی حال ہے، بھوک اور عورت ان کی شاعری کے محور ہیں۔ گل و بلبل کی شاعری تو دو سو سال چلی، لیکن ان کی عورت پچھلے دس سال ہی میں سارے منازل طے کر گئی، یہی وجہ ہے کہ بالعموم ان کی شاعرانہ زندگی فلم اسٹار کی طرح ہے، ان کی شاعری میں 'عمر برق و شرار ہے دُنیا' آخر میں میں ان میں سے چند کا سرسری ذکر اور کر سکتا ہوں۔

مختار صدیقی کی نظموں میں 'رات کی بات' ایک پابند رومانی نظم ہے۔ 'رسوائی'، 'سکھ میں دُکھ' بھی اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے رومان میں پناہ لی ہے، یہ دونوں نظمیں بھی پابند ہیں۔

اختر الایمان اکثر لکھتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر کے آثار اُن کے یہاں نہیں ملتے، انھوں نے اپنے مجموعہ کا نام "گرداب" خوب رکھا ہے۔ یہی حال اُن کی شاعری کا ہے۔ اُن کی نظموں میں "رقاصہ" ایک طویل پابند نظم ہے جس میں راشد کی طرح وہ بھی آلام روزگار سے پناہ لینے کے لئے آمادۂ رقص ہیں، اس رقص میں خوب و زشت بھی انھیں توہمات نظر آتے ہیں اور دنیا کے مختلف دھوکوں اور گھاتوں کا مفصل ذکر کرتے ہیں، اس خیال کی مزید وضاحت اُن کی نظم "مجرم" سے ہوتی ہے یہاں بھی راشد کی طرح خودکشی پر انجام ہوتا ہے، 'فیصلہ' میں اختر کا یہ خیال :

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں

میرے خیال میں "جواری" اختر کی اچھی نظموں میں ہے، اس میں جذبات کی شدت اور اشاریت کے باوجود ابہام نہیں۔ اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

ہم تو اپنی سی کر ہارے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی

سب ہی جواری، سب ہی لٹیرے، کون کس سے بازی جیتے بیت گئی جیسی بیتی، باقی چاہے جیسی بیتے

شام و سحر کی رنگ و نظر کی، پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی

'وداع' اور 'پکنڈنڈی' بھی اچھی نظمیں ہیں۔

قیوم نظر کی نظموں میں "حسنِ آوارہ" "برسات کی رات" "یہ اور وہ" رومانی نظمیں ہیں۔ "التجا" میں اپنے درد سے خطاب ہے:۔

مجھ کو دے کے موت، زندگی کو مار دے

جنگ، میں قیوم نظر جنگ کی تباہ کاریوں کو بیان کرتا ہے۔ "جوانی" بھی انھیں خیالات کی حامل ہے، جہاں قیوم نظر اس پر نوحہ کرنے لگتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں نسل انسانی کے جوان کس طرح بھینٹ چڑھ رہے ہیں "بنی آدم" میں "اشاریت" نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔

سلام مچھلی شہری کے خیالات بالکل سطحی اور انداز بیان خام ہے۔ اُن کے کلام میں "سڑک بن رہی ہے" "مجھکو آپ سے شکوہ ہے" "اندیشہ" "ڈرائنگ روم" اُن کے ملے جلے انداز کو ظاہر کرتی ہیں، اشتراکیت سے ہمدردی، رومان، اور ابہام سب موجود ہے۔ 'ڈرائنگ روم' میں وہی انداز ہے جو راشد کی نظم "انتقام" میں ہے۔ یہاں سلام ایک مفلس عورت کو اپنے "ڈرائنگ روم" کی سیر کراتا ہے اور پھر اس سے سیہ کاری کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے۔

اس مختصر جائزہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمارے نوجوان شعرا کیا سوچ رہے ہیں اور کس طرح اس کا اظہار کر رہے ہیں، ان رجحانات پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ یہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ ہے اور ہمارے نوجوان شاعر گویا ایک بحرانی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس لئے اُن کے متعلق کوئی قطعی رائے دینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ان میں ابھی بہت سی خامیاں ہیں جو ہر نئے انقلاب کے ساتھ آتی ہیں، بعض چیزیں اب بھی مہمل اور مبہم ہیں، لیکن شاعری کی تاریخ میں یہ بھی کوئی عجیب واقعہ نہیں، پہلے چیزیں ایسی ہی نظر آتی ہیں لیکن وقت اور تجربہ انھیں ان الائشوں سے پاک کر دیتا ہے۔ ممکن ہے بعض چیزیں اس نئے تجربہ میں جاندار ثابت ہوں اور انقلاب کا طوفان رُک جانے پر ہمارے شعر و ادب کا جز بن جائیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ وقت صرف دیکھنے کا نہیں سوچنے کا بھی ہے۔ اس لئے اس نئی شاعری پر غور کرنا ہمارے اور ترقی پسند شاعروں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اس نئی شاعری کے صرف دو مرکز یا محور ہیں انقلاب اور عورت، یہ صحیح ہے کہ زندگی کے اکثر پہلو انہی دونوں سے وابستہ ہیں۔ لیکن جس طرح متقدمین کی شاعری اپنی حدود سے باہر نہیں نکلتی تھی اسی طرح ان شاعروں نے بھی اپنی دُنیا تنگ کر لی ہے۔ اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرے یہ کہ بعض اصول اور مسلمات ایسے ہیں جو ازلی اور ابدی ہیں، بعض قدریں ہماری زندگی میں اضافہ نہیں

مستقل حیثیت رکھتی ہیں - اسی طرح شعر و ادب میں بعض ابدی عناصر موجود ہیں جن میں زمان و مکان کے انقلابات سے کوئی تغیر یا تبدیلی نہیں ہو سکتی، ہر شاعری اچھی یا بُری ہو سکتی ہے لیکن بڑی شاعری ہر اچھی شاعری کو نہیں کہا جا سکتا -

شعر کی اچھائی یا بُرائی کا تصور زمانہ کے ساتھ بدلتا رہا ہے لیکن دنیا کی ہر زبان میں بعض نام ایسے نظر آتے ہیں جنھیں حیاتِ ابدی اور قبول دوام حاصل ہو چکا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگانی کے ابدی حقایق کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی شاعری کا یہی وہ حصہ ہے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہا ہے - اس پہلو سے جدید شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ وقتی یا ہنگامی ہے، مثلاً بھوک کا مسئلہ، اس وقت بیشک یہ ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل میں ہے لیکن یہ صرف ایک اقتصادی مسئلہ ہے جس سے ہر کسی کو ہمدردی ہے، مسئلہ دولت کی غلط تقسیم - حکومت کے غلط طریقے اور بعض طبقوں کے اقتدار سے پیدا ہو گیا ہے، حیاتِ انسانی میں یا نظام عالم میں اس کی حیثیت مستقل یا ابدی نہیں، اگر آج یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اشتراکیوں کو اپنی فردوس گم گشتہ دوبارہ مل جائے تو آج ہی بھوک کے مسئلہ کے ساتھ بھوک کی شاعری بھی ختم ہو جائے - میں اس شاعری کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ میرے نزدیک بعض شاعروں نے اسی موضوع پر اچھی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں پھر بھی یہ بڑی شاعری نہیں - اس میں کسی ہمہ گیر، ازلی اور ابدی جذبہ کی تسکین کا سامان نہیں اسی لئے اس میں بڑائی نہیں -

اس بھوک کے مسئلہ نے شاعری میں کئی عناصر کو داخل کر دیا ہے - مثلاً بعض لوگ جو شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ موجودہ اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ زندگی کی بعض مستقل قدروں مثلاً مذہب اور اخلاق کے بنیادی تصورات کو بھی ایک کہنہ نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں - بھوک کا مسئلہ بغیر مذہب کی تضحیک اور استہزا کے بھی حل ہو سکتا ہے - چنانچہ بعض ترقی پسند ایسے ہیں جو اشتراکی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اُن کا آخری سہارا خدا ہی ہے - مثلاً احمد ندیم قاسمی کا یہی رنگ ہے - انجام سے مایوسی اور خودکشی اسی کا نتیجہ ہے - کیونکہ انسان جب کوئی سہارا نہیں پاتا تب ہی خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے -

ممکن ہے مجھے یا آپ کو اشتراکیت کے بعض پہلوؤں سے اختلاف اور بعض سے اتفاق ہو لیکن جس طرح ادب پر سرمایہ داروں سلاطین اور فرشتوں کا اجارہ نہیں اسی طرح ادب کو مزدوروں، غریبوں اور شیطانوں کی ملکیت سمجھنا بھی غلط ہے، اشتراکی شاعری موجودہ شاعری کا ایک شعبہ تو ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف اُن کے لئے جو واقعی مزدوروں کے کامریڈ اور اُن کے درد و دکھ کے شریک ہیں - لیکن یہ شاعری تمام شاعری نہیں ہو سکتی، یہ کہنا گویا شاعری سے اُس کی ہمہ گیری چھین لینا ہے، پھر ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو پیٹ کی بھوک اور جنسی خواہش کے ساتھ ایک روحانی بھوک بھی محسوس کرتے ہیں - اگر شاعری اُن کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہونچا سکتی تو یہ اس کی بڑی محرومی ہے - ترقی پسند شاعروں نے اس محرومی ہی کو کامیابی سمجھا ہے -

اگرچہ ادب میں احتساب کا میں قایل نہیں لیکن انسانیت کے ابتدائی اصول کسی اقتصادی مسئلہ کے حل کے لئے قربان نہیں کئے جا سکتے، ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کا جذبہ بے شک قابل ستایش ہے لیکن راشد کی نظم میرے نزدیک

شاعری سے زیادہ خرافات کے تحت میں آتی ہے۔ ایک اجنبی برہنہ عورت کے ہونٹوں سے رات بھر ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینا، گویا تسکین ہوس کی ایک آڑ ہے جس کا اندازِ بیان ہمارے داسوختوں سے کچھ زیادہ ہی فحش اور عریاں ہے۔ اسی طرح سلام مچھلی شہری کی نظم 'ڈرائنگ روم' یا مخمور جالندھری کی 'تالاب' ادبی خرافات ہیں۔ آخر الذکر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ابھی کل ہی کا قصہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی مچھلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی، میل سے چکٹی، نزاکت سے
لگی ہنس ہنس کے میرے پاس آکر ہاتھ پھیلانے
اُدھر وہ رحم کی طالب، ادھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے، اگر اک رات اس کے ساتھ کٹ جائے

حقیقت نگاری شاعر کا فرض سہی لیکن کیا یہ حقایق اسی طرح منظر عام پر عمل میں بھی لائے جا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو ان کا بیان کس طرح سند جواز حاصل کر سکتا ہے۔

ترقی پسند شاعری کے ٹکنیک کے سلسلہ میں بہت کم کہنے کی ضرورت ہے۔ راشد کے بقول اجتہاد صرف یہ نہیں کہ ہر پُرانی چیز کو ترک کر دیا جائے۔ اجتہاد جب ہی اجتہاد ہو سکتا ہے جب پُرانی چیزوں کی تلافی بہتر بدل سے کر دیجائے۔ وزن، ردیف اور قافئے کے پُرانے قانون واقعی دقیانوسی ہیں اور ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، لیکن ہر قانون سے آزادی صرف اپنے عجز اور کمزوری کی دلیل ہو سکتی ہے۔ مثلاً وزن کے قانون سے آزاد ہونا شاعر کے بس میں نہیں۔ وزن انسانی توجہ کے لئے بڑا زبردست محرک ہے اسی وجہ سے ہم نثر کے مقابلہ میں نظم زیادہ آسانی سے یاد رکھ سکتے ہیں، اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اٹلی کے وہ شاعر جنھوں نے غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کا پہلا تجربہ کیا تھا گمنامی کی آغوش میں پہونچ چکے ہیں۔ پھر وہ نظم جو گائی نہ جا سکے یوں بھی ابدیت سے محروم ہے۔ اس اعتبار سے ترقی پسند شاعری کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ ایک کتابی شاعری اور ایک شاعرانہ شاعری، آزاد نظمیں کتابی شاعری کے تحت میں ہیں۔ گیت، سانیٹ، پابند غیر مقفیٰ نظمیں گائی جا سکتی ہیں اور شاعرانہ شاعری میں داخل ہیں۔

اسی شاعری کا ایک اور غور طلب پہلو اشاریت اور اس سے پیدا ہونے والا ابہام ہے۔ ابہام متقدمین کے یہاں بھی ملتا ہے بلکہ لوگوں نے آخر عمر میں چیستان اور معمہ گوئی بھی اختیار کی ہے۔ امانت اور محسن اس کی دو مثالیں ہیں مگر اُن کی انتہا ترقی پسندوں کی ابتدا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی Symbolic اور Imagist اسکول کی طرح ان کی ایک شاعرانہ دُنیا اپنی خلق کی ہوئی ہے وہاں کی چیزوں کا بیان استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے لیکن جس قسم کے چند اشاروں کا ذکر میں نے اوپر کیا وہ شاعر کے عجز کا اظہار کرتے ہیں۔

اب جب کہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ کی ابتدائی منازل سے کچھ آگے نکل چکی ہے اور اس کے بعض میلانات اور رجحانات مسلّم ہو چکے ہیں، ضرورت ہے کہ ترقی پسندی کا کوئی معیار مقرر کیا جائے۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ ترقی پسند کوئی ایسا ادارہ یا اکیڈیمی قایم کریں جو ترقی پسند تحریک کی نگرانی اور صحیح ترقی پسند ادب کی اشاعت کی ذمہ دار ہو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ترقی پسند شاعری نام نہاد ترقی پسندوں کی مہمل گوئی، عریاں نگاری اور فحاشی کی وجہ سے بدنام ہو جائے اور نئی شاعری کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو۔ ترقی پسند تحریک میں زندگی کے آثار ہیں کیونکہ ترقی کا راستہ کبھی مسدود نہیں ہوتا۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(اقتباس از "مصنف") ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

مغل لائن لمیٹیڈ

لڑائی کے زمانہ میں ہمارے ان جہازوں کے اوقات جو سامان اور مسافروں کو عدن، جدہ، پورٹ سوڈان، مصر اور مارسیلس تک لیجاتے تھے، مجبوراً بے قاعدہ ہو گئے ہیں، لیکن صلح اور فتح کے بعد کمپنی کے تمام جہازوں کی آمد و رفت پھر باقاعدہ ہو جائے گی اور مسافروں اور سامان بھیجنے والوں کے لئے بدستور سابق پھر آسانیاں ہو جائیں گی۔

ٹرنر مارسین اینڈ کو

مینجنگ ایجنٹس مغل لائن کمپنی

۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

ماخذ القرآن پر ایک نظر

سالنامہ "نگار" اس سال ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ موضوع کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض اصحاب اسے پسند نہ کریں کہ ایک عیسائی مشنری ڈاکٹر ٹسڈل کی مفوات نگار ایسے کثیر الاشاعت اور موقر ماہنامے میں شایع ہوں اور قارئین نگار مولانا نیاز کی شستہ اور منجھی ہوئی زبان میں مزے لے لے کر انھیں پڑھیں۔ ہوسکتا ہے کہ عام قارئین پر اس کا کچھ اچھا اثر نہ ہو۔ لیکن میں علم اور تحقیق کے سلسلہ میں مصلحت کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ماخذ القرآن پر ڈاکٹر ٹسڈل کے زیر نظر مقالہ نے جو خیالات میرے ذہن میں پیدا کر دئے ہیں ان کا تعلق بیک وقت تاریخ، فلسفہ مذہب، نفسیات اور لسانیات سے ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان تمام مباحث پر تفصیل کے ساتھ لکھا جائے لیکن کاغذ کی گرانی "نگار" کے قیمتی صفحات کی تنگ دامانی اور فرصت کی قلت یہ تمام اسباب مجبور کر رہے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک نقطہ کو لیکر اس پر بحث کی جائے۔

ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب تمہید کو چھوڑ کر پورے پانچ ابواب میں پھیلی ہوئی ہے۔ جن میں سے پہلے اور آخری باب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بتانا چاہا ہے کہ اسلام نے عرب جاہلیت کی رسوم اور گرد و پیش کی خالص عربی تحریکوں سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ میری نگاہ میں ڈاکٹر ٹسڈل کی تصنیف کا یہ حصہ زیادہ اہم ہے اس لئے کہ اس میں اسلام کی مخصوص تعلیمات، قرآنی احکام و اوامر اور شرعی و عمرانی اصلاحات کو جاہلی عرب سے ماخوذ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری باب میں خصوصیت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کی امتیازی تعلیم یعنی توحید الٰہی بھی کوئی جدید تحریک نہیں بلکہ حضور رسالت پناہ سے پہلے عرب میں اسی قسم کی ایک تحریک اور بھی تھی جس میں شامل ہونے والے اصحاب "حنیف" کہلاتے تھے۔ اس تحریک کا مقصد تھا ایک خدا کی پرستش اور عرب کی جاہلانہ رسوم اور اخلاقی ناسزا کاریوں کی مذمت اور ان کا استیصال۔

بے شبہ حضرت رسالت سے پہلے ہی عرب کے کچھ باشندے بت پرستی ایسی رسم قبیح سے نفور ہو گئے تھے اور ان میں زید بن عمرو بھی تھے۔ لیکن یہ لوگ عرب کے اس روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو قریب قریب ہر قوم میں پایا جاتا ہے خواہ وہ کتنی ہی پست تر اور ذہنی اعتبار سے گری ہوئی کیوں نہ ہو۔ یہ طبقہ اس قوم کا زیرک (Intellectual) حصہ کہلاتا ہے۔ ان چند لوگوں کے وجود سے اسلام کی وسیع اور ہمہ گیر تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زید بن عمرو اور ان کے ہم خیال چند اور عرب شاید اس کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے کہ بت پرستی ایک طرح کی گمراہی ہے اور ابراہیم علیہ السلام جو خدا